سینیٹر پروفیسر خورشید احمد

اسلام اور "نیو ورلڈ آرڈر"

(۱)

دنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے لیے "نیو ورلڈ آرڈر" (نیا عالمی نظام) جنم لینے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی نے بہت سے رہنماؤں کو ایک نئے عالمی نظام کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈرو ولسن نے مستقبل کے عالمی نظام کے موضوع پر مباحثے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جس میں کچھ اصولوں اور تسلیم شدہ آفاقی قدروں کی حکمرانی کا تصور تھا۔ یہ خواب لیگ آف نیشنز کی ناقص ساخت اور اس کے فوری خاتمے کے ساتھ بکھر گیا۔ دنیا نہ ایک نئی جنگ سے بچ سکی اور نہ جمہوریت ہی محفوظ رہی بلکہ دنیا "دائیں" اور "بائیں" بازو کی کلیت پسندی کے نرغے میں گھر گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بار پھر نئی امیدیں پروان چڑھنے لگیں۔ اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نئے عہد کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ مگر بہت جلد یہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور نسلِ انسانی تباہ کن سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی جو چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

حالیہ برسوں میں "نئے عالمی نظام" کی تلاش میں تیزی آئی ہے۔ سرد جنگ کے مفروضہ اختتام پر سابق امریکی صدر جارج بش نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ کویت پر عراقی حملے اور امریکہ کی سرکردگی میں لڑی گئی خلیجی جنگ کو نئے عالمی نظام کا ابتدائیہ قرار دیا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ "مستقبل میں کوئی جارح اپنے کیے کی سزا پائے بغیر نہ رہے گا" اور "طاقت کے بل بوتے پر کسی کا قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ مزید کہا گیا کہ "بین الاقوامی سرحدوں میں یک طرفہ طور پر ردوبدل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سب کو انسانی حقوق کی پابندی کرنا پڑے گی"، اور "یہ امر بھی یقینی بنایا جائے گا کہ قومی سرحدوں کی پروا کیے بغیر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خاتمہ ہو سکے"، اور "اقوام متحدہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک نیا کردار ادا کرے گی۔" ان اصولوں کے تعین کے ساتھ یہ باور کر لیا گیا کہ اب نسلِ انسانی جمہوریت اور سلامتی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔

ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ کسے اتفاق نہیں ہو گا؟ تاہم سوال یہ ہے کہ وہ قومیں جو آج کی دنیا میں

سیاسی لحاظ سے طاقتور ہیں، کیا وہ ان مقاصد کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں یا وہ محض اپنے مخصوص مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ان نعروں کو استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟ یہ انتہائی بنیادی اور اہم سوال ہے۔

(۲)

مسلم دنیا ــ کل اور آج

آج مسلمان دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی تعداد تقریباً ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے۔ ۵۳ آزاد مسلم مملکتوں میں ۸۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ مسلم مملکتیں دنیا کے ۲۳ فیصد رقبے پر محیط ہیں۔ اگرچہ مسلم آبادی مشرقی اور وسطی یورپ میں بھی ہے تاہم البانیہ میں مسلمانوں کی تعداد ۷۳ فیصد ہے۔ جبکہ بوسنیا ہرزے گووینا میں یہ قابلِ لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی مسلمان بھاری تعداد میں آباد ہیں، بالخصوص یورپ اور امریکہ میں، جہاں اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔

تاہم اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے بارے میں مغرب میں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک ایسا مذہب جو امن اور انصاف کا علمبردار ہے، اسے جنگ اور جنونیت کے مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزار سال سے زائد کے عرصے میں مسلمان دنیا میں نہ صرف ایک غالب قوت رہے ہیں، بلکہ اسلامی تہذیب اور معاشرے نے غیر مسلموں سمیت سب کو امن اور تحفظ فراہم کیا۔ حقیقت میں یہ مسلم دنیا ہی تھی جو ان تمام لوگوں کے لیے پناہ گاہ اور جائے امان رہی، جنہیں دنیا کے مختلف حصوں، بالخصوص یورپ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) مسلم ریاست اور معاشرے، جو لازماً اسلام پر مبنی تھے، کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی مشہور تصنیف The Making of Humanity میں لکھتے ہیں۔

> مشرق میں تھیا کریسی فکری لحاظ سے ظالم اور جابر نہیں تھی۔ ہم وہاں ابہام اور جمود، سوچ پر پابندی اور فکری اختلاف کے خلاف مسلسل جنگ کا وجود نہیں پاتے جو یورپی دنیا کی معروف خصوصیت ہے اور جسے یونان اور روم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ (صفحہ ۱۱۳)

تاریخ دان میور (Muir) واضح الفاظ میں رقمطراز ہے کہ

> مفتوحین کے ساتھ [مسلمانوں کی] نرم روی، ان کا انصاف اور دیانتداری، رومنوں کے ظلم و تشدد اور عدم رواداری کے مقابلے میں ایک متضاد تصویر پیش کرتی ہے۔ شامی

عیسائیوں کو عرب فاتحین کے تحت اس سے کہیں زیادہ شہری آزادی حاصل تھی، جتنی انہیں ہرکولیس کے اقتدار میں حاصل تھی، اور انہیں اپنی سابقہ حالت میں لوٹ جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی"۔ (The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall, p.128)

یہ ہے انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا ریکارڈ۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران میں صورت حال میں ٹھوس تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس عرصے میں مغربی استعماری طاقتیں دنیا پر حکمران رہی ہیں اور مسلم دنیا بحیثیت مجموعی مغربی ملکوں کے زیر تسلط رہی ہے۔ اس دور میں تیسری دنیا کی اقوام اور عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص استعماری طاقتوں کے ہاتھوں کئی انداز میں نقصان اٹھانا پڑا۔ آرنلڈ ٹائن بی نے مغرب کے ساتھ دنیا کے تعلقات پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

دنیا اور مغرب کے درمیان تعلقات میں، جو گزشتہ چار پانچ سو سال سے چلے آرہے ہیں، مغرب نہیں بلکہ دنیا ہی اب تک وہ فریق ہے جسے سخت تجربے سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مغرب نہیں، جس پر دنیا کی ضرب پڑی ہے، بلکہ یہ دنیا ہے جسے مغرب کی چوٹ برداشت کرنی پڑی ہے اور یہ چوٹ بہت سخت ہے۔ دنیا کہے گی کہ مغرب عصر جدید کا سرکردہ جارح ہے اور یقیناً مغرب کے بارے میں دنیا کا یہ فیصلہ گزشتہ چار ساڑھے چار صدیوں کے عرصے کے حوالے سے جو ۱۹۵۰ء میں ختم ہوا، بجا دکھائی دیتا ہے۔ (The World and The West, pp.1-4)

پروفیسر فلپ کے ہٹی (Phillip K. Hitti) ماضی قریب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے، بالخصوص گزشتہ ایک یا دو دہائیوں میں مغرب کے اثرات سب اچھے نہیں رہے۔ مغربی مشنریوں، اساتذہ اور مبلغین کے انسانیت نواز نظریات اور یورپی و امریکی سیاست دانوں اور جنگ جوؤں کی طرف سے انسانی اقدار کی بے حرمتی کے واقعات کے درمیان ایک واضح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ قول و فعل کے درمیان تضاد ہے اور اس عرصے میں اقتصادی اور قوم پرستانہ اقدار پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ گزشتہ دو جنگوں میں ترقی یافتہ اقوام نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مغرب کے انسان میں ان شیطانی قوتوں کو جو اس کی سائنس اور مشینوں نے تیار کی ہیں اور جو اس وقت دنیا کی تباہی کا باعث بن چکی ہیں، استعمال کرنے کی صلاحیت، اور پھر مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور دیگر اقوام کا مسئلہ فلسطین کے

بارے میں طرز عمل، ان تمام باتوں نے مشرق قریب کے اس انسان کو مایوس کرنے میں حصہ لیا ہے جو مغرب کے ساتھ تعلق استوار کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ مغرب کے ان اقدامات سے مشرق کا انسان اس سے برگشتہ ہوا ہے۔ اس کا مغربی انسان کے کردار اور اس کے اخلاق، چاہے وہ نجی ہوں یا معاشرتی، پر ایمان متزلزل ہو گیا ہے۔
("Current Trends in Islam" by Phillip K. Hitti in "Islam in the Modern World")

ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مسلم دنیا جو ماضی میں مغرب کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکی ہے اور جو ابھی تک مادی، اقتصادی، تکنیکی اور فوجی لحاظ سے کمزور ہے، اسے مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنے تشخص کی بازیافت کے لیے مسلمانوں کی کوششوں اور اُن کی طرف سے اپنے معاملات کو درست کرنے کی مساعی کو مغرب کے لیے ایک چیلنج بتایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں جمہوری عمل کی تقویت اور خودانحصاری کے حصول کے لیے جو بے ضرر سی کوششیں کر رہے ہیں، انہیں "اسلامی بنیاد پرستی" کے خودساختہ دیو کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کے سابق صدور جیسے رچرڈ نکسن (Seize the Moment) اور رونلڈ ریگن (An American Life) سے لے کر فرانسس فیکویاما (The End of History and the Last Man) جیسے دانشور اور رچرڈ ففٹ جیسے کالم نگار اور دوسرے سب اسلام کو مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔ وہ سب یہی ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں کہ "اگر کوئی بھوت یورپ اور امریکہ کا پیچھا کر رہا ہے تو وہ اسلامی بنیاد پرستی کا بھوت ہے۔" یہ ایک غیر حقیقی اور یک طرفہ جنگ ہے اور سیاستدان، صحافی اور ذرائع ابلاغ کے لوگ، حتیٰ کہ بعض اہل تحقیق بھی خوف سے بھرپور ایسا منظر نامہ ابھارنے میں ایک فریق بن چکے ہیں۔

لیکن اس سے بڑھ کر سچائی سے بعید کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ یہ بجا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں اسلام کا اُحیاء جاری ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے ملکوں میں یا ان سے باہر کسی کے خلاف کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں۔ استعماری تسلط کے دوران میں مسلمانوں نے نظریاتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی حتیٰ کہ اخلاقی لحاظ سے نقصان اٹھایا ہے تاہم مسلم ریاستوں کی آزادی کے بعد سیاسی لحاظ سے انہوں نے کچھ پیش رفت کی ہے۔ اس وقت ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان، اقدار اور تاریخ کی روشنی میں اقتصادی، تکنیکی، تعلیمی، نظریاتی اور ثقافتی پہلوؤں سے اپنی زندگیوں کو استوار کر سکیں۔ وہ الگ تھلگ ہو کر رہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں، لیکن وہ دوسروں کے "باج گزار" بن کر نہیں، انسانی حلقے کے باوقار رکن کی حیثیت سے عزت اور احترام کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

(۳)

بنیاد پرستی کا ہوّا

"بنیاد پرستی" واضح طور پر عیسائی مذہب کا ایک مظہر ہے، اس کا اسلامی فکر و عمل میں کوئی مقام نہیں ہے۔ ماضی قریب کی مغربی تاریخ میں یہ اصطلاح امریکہ کے ان انجیلی لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے جو بائبل کی لفظی تعبیر کے علم بردار اور کنواری مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر ایمان رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں نہ صرف ذاتی سیرت و کردار مسیحی اخلاقیات پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ سماجی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی مسیحی اخلاقیات ہے۔ انھوں نے مغربی زندگی اور ثقافت کے بعض پہلوؤں پر کڑی نکتہ چینی کی اور انھیں مسیحی اخلاقیات سے انحراف قرار دیا۔ ان گروہوں کو مخالفین نے انتہا پسند اور جنونی قرار دیا، اس لیے ان کے لیے "بنیاد پرست" کی اصطلاح منفی معنوں میں استعمال کی جانے لگی۔

چنانچہ اس واضح مسیحی اصطلاح کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا نہ صرف غلط اور بد نیتی پر مبنی ہے، بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی قابل نفرین ہے۔ اسلام میں روحانی اور مادی زندگی میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ روحانی اور دینی زندگی ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ اسلام میں سیاست اور مذہب میں اس قسم کی کوئی مغائرت نہیں، جیسی عیسائی دنیا میں موجود ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتا ہے۔ پورے قرآن پر ایمان ضروری ہے اور اس میں سے کچھ لینے اور کچھ چھوڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

(۴)

اسلام، مغرب اور دُہرے معیار

اگا دگا انسانی ناکامیوں کے باوجود تاریخ میں رواداری کے حوالے سے اسلام کا ریکارڈ نہایت شاندار ہے۔ اسلام اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے پیروکاروں کو انتہا پسندی سے احتراز کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام رواداری اور دوسروں کے جذبات کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ معاصر مسلمان تشدّد اور دہشت گردی کی مخالفت میں کسی بھی مہذّب شخص سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو ان دُہرے معیاروں پر حیرت ہے جن کا مظاہرہ مغربی دنیا کی قیادتوں نے کیا ہے۔ اگر کویت کے معاملے میں غیر قانونی اور یک طرفہ قبضہ ایک جُرم تھا، تو فلسطین پر اسرائیلی، کشمیر پر ہندوستانی اور بوسنیا پر سربیا کے قبضے کو بھی ویسا ہی جُرم قرار دیا جانا چاہیے۔ اگر بعض مسلمانوں کے تشدّد کی مذمّت کی جاتی

ہے تو ارضِ فلسطین میں اسرائیلی شہریوں اور قابض فوجوں کے کہیں زیادہ مظالم کی مذمت کیوں نہیں ہوتی؟ یہی صورتِ حال ہندوستان کے مسلم کش فسادات اور کشمیر میں ہندوستانی مظالم کی ہے۔ جابر حکمرانوں کے ستائے ہوئے افراد کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے کہیں زیادہ گھناؤنا جرم کسی ریاست کی طرف سے تشدد پر اتر آنا ہے۔ مستبد طرزِ حکومت بُرا ہے لیکن ہر کہیں بُرا ہونا چاہیے۔ ایسا کیوں ہے کہ دنیا کے کچھ حصوں میں مستبد حکومتوں کی حمایت کی جاتی ہے اور کچھ دوسرے حصوں میں ان کی مذمت! کیا یہ منافقت نہیں ہے؟

جمہوری عمل پسندیدہ ہے، لیکن اسے ہر کہیں پسندیدہ ہونا چاہیے۔ مصر، الجزائر اور انڈونیشیا کے عوام برابر کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی حکومتیں منتخب کر سکیں۔ جب ان مسلم ملکوں میں، جن کے حکمران عالمی طاقتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، آزاد انتخابات سبوتاژ کر دیے جاتے ہیں تو مغرب کے بہت سے رہنماؤں کے ضمیر کوئی خلش محسوس نہیں کرتے۔

جب ترک قبرصیوں کو ہر طرح کے تعصب کا نشانہ بنایا گیا، ان کے حقوق سلب کر لیے گئے، انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا، حتیٰ کہ ان کا وجود ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مغرب ٹس سے مس نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ قبرص میں ضامن طاقت کا کردار رکھنے والی برطانوی حکومت، جس کا قبرص میں فوجی اڈہ تھا، خاموش تماشائی بنی رہی۔ یونانی قبرصیوں کو موقع فراہم کیا گیا کہ وہ حتمی بغاوت برپا کریں، لیکن جب ترکی نے دوسری ضامن طاقت کے طور پر اپنا حق استعمال کیا تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ لیبیا کو بھی اسی طرح کی یک طرفہ مداخلت، بین الاقوامی پابندیوں اور بلیک میل کے لیے نشانہ بنایا گیا ہے۔ آج بوسنیا ہرزے گووینا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کی ایک اور واضح مثال ہے۔

مغربی طاقتیں جارح فریق کو یہ پیغام دینے میں ناکام رہی ہیں کہ جارحیت کی کوئی سزا ہے۔ اس کے بجائے تمام اشارے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا مغربی دنیا، نیٹو اور امریکہ جیسی عالمی طاقت، اپنی تمام تر عسکری قوت کے باوجود سربیائی جارحین کے سامنے بے بس ہے، جنہیں اس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو مظالم چاہیں توڑتے رہیں، جس قدر زمین وہ چاہتے ہیں اس پر قبضہ کریں، جتنے لوگوں کو چاہیں قتل کریں اور جتنے رقبے کو چاہیں مخالفین کے وجود سے "پاک" کر دیں۔ وہ جو بین الاقوامی قانون، امن اور سلامتی کے علمبردار ہیں، طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے معاہدوں اور لاشوں کے ڈھیر پر اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں کہ جارح اپنا کام ختم کر لے، اور پھر یہ حرکت میں آئیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے جارح اور مظلوم کے درمیان ایک معاہدہ کرا دیں، تاکہ جارح نے جو کچھ طاقت کے اندھے استعمال سے حاصل کیا ہے، اسے سندِ جواز حاصل ہو جائے۔ جب مظلوم اپنے دفاع کے لیے امداد اور ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے راستے میں اقوامِ متحدہ کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں، اور اگر اتفاق سے کچھ ہمدرد "مہذب" رکاوٹوں کو

عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انہیں جنونی اور بنیاد پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلم احیاء اور اس کی رفتار کو جنونیت اور بنیاد پرستی کہہ دینے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوگا، صرف مسلم عوام کی نظروں میں مغربی قیادت کا اعتماد ہی مجروح ہوگا۔

مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس قسم کے کوئی آثار نہیں بلکہ اس بات کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مسلح ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں یا وہ مغرب کے سیاسی نظام کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن جائیں۔ مسلمان محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اقدار اور تصورات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں سنوارنے کا حق چاہتے ہیں۔ اسلامی احیاء کی تحریکیں جدت سے الرجک نہیں ہیں۔ وہ Modernization اور مادی ترقی کی حامی ہیں لیکن یہ Modernization اور ترقی وہ اپنی ثقافت اور اقدار کے تناظر میں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتیں کہ ایک روشن تہذیب اور ثقافت کی حامل قوم پر کھلم کھلا یا ڈھکے چھپے ہتھکنڈوں سے مغربی تہذیب اور اس کی اقدار مسلط کر دی جائیں۔

اقتصادی یا ثقافتی استعمار بھی اتنا ہی بُرا اور تباہ کن ہے جتنا کہ سیاسی استعمار۔ دنیا زندگی بسر کرنے کے لیے صرف اسی صورت میں محفوظ جگہ بن سکتی ہے جب تمام قومیں اور عوام یہ اصول تسلیم کر لیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا مستقبل اپنے نظریات اور اصولوں کے مطابق تشکیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ خیالات کا آزادانہ تبادلہ ہونا چاہیے، مگر کسی خاص مجموعۂ اقدار، ثقافت یا نظام کو دوسروں پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ زندگی کی بوقلمونی اور ثقافتی و نظریاتی تنوع کو حقیقی اور جائز تسلیم کرنے سے ہی مختلف اقوام اور عوام ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کی فضا میں رہ سکتے ہیں۔ مسلم عوام کسی خاص ملک کی، چاہے وہ اقتصادی یا فوجی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ چھوٹی قومیں اور کمزور ممالک بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہیں۔ امریکی بالادستی (Pax-Americana) بھی اتنی ہی گھناؤنی چیز ہے، جتنی کہ برطانوی بالادستی (Pax-Britainica) یا ہسپانوی بالادستی۔ یک قطبی دنیا یا ایک عالمی طاقت کی باتیں نئے خوف اور خدشات کو جنم دے رہی ہیں اور ایک نیا استعماری نظام ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی منصفانہ عالمی نظام کسی ایک کی بالادستی پر مبنی کارروائیوں کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔

مسلم عوام اور تیسری دنیا کی اقوام نئی بالادستی کو کبھی قبول نہ کریں گی۔ چھوٹی اور بڑی، غریب اور امیر، کمزور اور طاقتور سب اقوام کو جینے اور اپنی اقدار اور معیارات کے مطابق زندہ رہنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ سب کو پھولنے پھلنے کے برابر کے مواقع ملنے چاہییں۔ کسی کی طرف سے دوسروں پر اپنی بالادستی کا تسلط ہی بین الاقوامی کشیدگی اور تصادم کی جڑ ہے۔ اگر مغرب انسانیت کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی جانب پیش رفت میں مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے تو اسے ذرا زیادہ خود احتسابی سے کام لینا چاہیے۔

اسلام اور جمہوریت

یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ اسلام جمہوریت کے خلاف ہے۔ اس مفروضے کی بنیاد سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جمہوریت، فلسفیانہ سطح پر، انسان کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اصول تسلیم کرتی ہے، نیز ابدی اور حتمی مذہبی یا اخلاقی قدروں سے انکار کرتی ہے۔ جمہوریت کا یہ فلسفیانہ تصوّر دنیا اور معاشرے کے سلسلے میں اسلامی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو الٰہی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مسلمان کہا ہی اس شخص کو جاتا ہے جو الٰہی قانون کو اپنے انفرادی اور اجتماعی روّیے کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ اسلام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی وجود نہیں، غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام نے انسانی نیابت (خلافت) کا تصوّر پیش کیا ہے۔ یہ خلافت بحیثیتِ مجموعی عوام کو حاصل ہے، یہ کسی ایک گروہ یا طبقے تک محدود نہیں۔ الٰہی قانون دائرہ کار فراہم کرتا ہے۔ اس نظامِ قانون میں لچک اور تبدیلی کی وسیع گنجائش ہے جو "مباح" کے ذیل میں آتی ہے۔ کتاب اللہ کی تشریح و تعبیر کا حق ہر اس شخص کے لیے ہے جو علم رکھتا ہے اور جس میں اس کی تفہیم و تعبیر کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام کے قانونی نظام کے دائرہ کار میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔

اسلام میں حکمرانی کا اختیار کسی کو اس کے مذہبی منصب کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔ معاشرے کے تمام افراد کا نہ صرف یہ حق، بلکہ فرض ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور ان افراد کے حوالے کریں جن پر انہیں اعتماد ہے۔ سیاسی قیادت عوام اور خدا کے سامنے براہ راست جوابدہ ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کی حکمرانی ہے اور اس میں اقلیتوں سمیت معاشرے کے تمام ارکان کے بنیادی حقوق کے تحفّظ کا اصول موجود ہے۔ حکومت کے جواب دہ ہونے کا تصوّر اسلامی نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا عوام کی مرضی سے انتخاب اور اس کی برخواستگی مسلّمہ اصول ہے، اور یہی بات اختلافِ رائے اور عدمِ اتفاق کے سلسلے میں درست ہے۔

عملی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام ان اصولوں پر مبنی ہے اور اس طرح جمہوری عمل کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں جن مقاصد کے حصول کا خواہش مند ہے، انہیں مسلم دنیا کی بعض حکومتوں کے طور طریقوں کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جانا چاہیے، چاہے وہ اسلام کا نام ہی کیوں نہ استعمال کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ معاصر دنیا میں جمہوریت کی ناگوار صورتِ حال کے قریب قریب ہے۔ بہت سے جمہوریت کے دعویدار حقیقت میں جمہوری اصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے۔ اس

انحراف کو جمہوریت کی ناکامی پر محمول نہ کیا جانا چاہیے بلکہ اسے محض کچھ لوگوں یا ملکوں کا انحراف خیال کرنا چاہیے۔

اگر اسلامی جمہوری نظام کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسے الٰہی تعلیمات پر مبنی جمہوری نظام سمجھا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکردہ مسلم مفکر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کے سیاسی نظام کو "الٰہی جمہوری" (Theo - democratic) قرار دیا ہے۔ اسلام میں تھیوکریسی کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ تھیوکریسی میں ایک مخصوص مذہبی گروہ کو مذہبی قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہی گروہ سیاسی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ اسلام کسی ایسے مذہبی انتظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام قانون کی حکمرانی اور قانون کی نظر میں سب کے مساوی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ جواب دہی کے اصول اور عوام کی مرضی سے حکومت کی تبدیلی اور تشکیل کا علمبردار ہے۔ آج مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر تشویش ہے کہ اسلام ایک طرف جمہوریت مخالف نظریے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، اور دوسری طرف جمہوری عمل سے ابھرنے والی اسلامی قوتوں کو اپنے ہی ملکوں میں برسراقتدار آنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، جیسا کہ حال ہی میں الجزائر میں ہوا ہے اور اسلامی جمہوری قوتوں کا راستہ روکنے والوں کو مغرب کی پوری تائید حاصل ہے۔

(۶)

اسلامی احیاء اور "نیو ورلڈ آرڈر"

آج کے مسلم ذہن کو سمجھنے کے لیے اسلامی احیاء کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ مسلمان ایک نئے منصفانہ عالمی نظام کے وجود میں آنے کے شدّت سے منتظر ہیں، نہ کہ محض نئے عالمی نظام کے، جس میں کسی ایک ملک کی بالادستی مقصود ہو۔ اسلامی احیاء نہ صرف منفرد ہے بلکہ عالمگیر بھی ہے۔ اسلام میں تنوّع کے ساتھ وحدت ہے، اور یہ تنوّع انفرادیت کو مجروح نہیں کرتا۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس میں "عرب اسلام"، "پاکستانی اسلام"، "ایرانی اسلام" یا "ترک اسلام" نام کی کوئی چیز نہیں ہے، تاہم اسلامی عالمگیریت میں وحدت ہے، یکسانیت نہیں۔

اسلام میں بعض نمایاں پہلو ہیں جو ہر جگہ مشترک ہیں۔ لیکن اس سے تحریک کی زرخیزی متاثر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر عربی، قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان ہے، لیکن یہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اگرچہ ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ عربی زبان سیکھتا ہے لیکن دیگر زبانیں بولنا اور انہیں ایسے تصوّرات کو پروان چڑھانے کے لیے، جو اسلامی روایات سے مطابقت رکھتے ہوں، بطور آلہ استعمال کرنا کچھ کم اسلامی نہیں ہے۔

مسلمان اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی کے سطحی مظاہر کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور قرآن وسنّت میں بیان کردہ بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان علامات مثلاً بعض مخصوص رسوم یا فقہی ضوابط کی بعض تفاصیل وغیرہ، سے بے پروائی بھی شامل ہو سکتی ہے، جو مذہبی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ حالیہ احیاء کی بنیادی روح یہی "اصل کی جانب رجوع" ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع ایک آزادی بخش قوت ہے۔ اسلام میں اس سے ایک متحرک عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع "بنیاد پرستی" کو جنم نہیں دیتا، جو انسان کو وقت کے ساتھ چلنے نہیں دیتی۔ بلکہ یہ عمل زاویۂ نظر کی تازگی، ایک نئی لگن، نیا تحرک اور نئی لچک دیتا ہے، نیز چیلنجوں کا سامنا کرنے کی اہلیت دیتا ہے۔ لوگ اسلام کو تہذیب اور ثقافت کے ماخذ کے طور پر دوبارہ دریافت کر رہے ہیں اور اس دریافت کو معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔

میری رائے میں، جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں مغرب کی غلامانہ نقالی سے دوری پیدا ہوتی جارہی ہے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں، اس میں فرق آتا جارہا ہے۔ مغربی تجربے سے ہم متعدد طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر ہم غیر ملکی ثقافتوں کو اپنے ہاں مسلط کرنے کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال ہونے کو تیار نہیں۔

بلاشبہ تمام مسلم ممالک کا مغربی ثقافت کی جانب روّیہ یکساں نہیں ہے۔ وہ ملک جو کچھ عرصہ پہلے مغربیت پرستی کے ہراول دستے میں شامل تھے وہ اب اسلامی احیاء کے علمبردار ہیں۔ جبکہ ایسے ممالک جو دنیا سے کافی پیچھے دکھائی دیتے تھے، اور اپنی روایات کے ساتھ سختی سے چمٹے ہوئے تھے، اب مغربی طرزِ زندگی اور ثقافت کے دلدادہ ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ کیا مسلم ممالک ترقی اور ٹیکنالوجی کے معاملات کو مسترد کرنے کے حقیقی معنوں میں متحمل ہو سکتے ہیں، جو ان کی علاقائی خوش حالی اور ان کے انسانی وسائل کی ترقی کی بنیاد ہیں؟ یہ سوال اس مسئلے پر پائے جانے والے الجھاؤ کا ایک جامع خلاصہ ہے۔ ترقی اور ٹیکنالوجی سے کے انکار ہے لیکن حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ کس قسم کی ترقی، اور کن مقاصد کے لیے؟ کیا یہ محض اقتصادی ترقی ہوگی یا مجموعی انسانی ترقی جس میں اقتصادی، سماجی، اخلاقی اور نظریاتی پہلو شامل ہیں اور یہ ترقی منصفانہ سماجی نظام کے قیام پر منتج ہوگی؟ کیا ہمارے پیشِ نظر ایک ایک ریاست کے تناظر میں ترقی کا تصوّر ہے یا امّت مسلمہ کی ترقی مقصود ہے۔ کیا اس کا مطلب حالیہ تاریخ کی جانب رجوع ہے کہ مسلم قومی ریاستوں کو ختم کیا جائے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ریاستیں اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک نئے مستقبل کی تشکیل پر توجہ دیں؟

میری رائے میں حالیہ تاریخ کی طرف واپسی کا کوئی سوال نہیں ہے، لیکن ہم ماضی قریب کے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ تعمیری انداز میں پیش رفت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم قومی ریاست کو

ایک نکتۂ آغاز کے طور پر قبول کر سکتے ہیں، اگرچہ قومی ریاست مسلم نقطۂ نظر سے مثالی ریاست نہیں ہے۔ تاہم موجودہ وقت کی حقیقت یہی ہے، اور ہم سیاسی نظاموں کو فی الفور ختم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم امّتِ مسلمہ میں اتحاد، قریبی تعاون اور مختلف مسلم ریاستوں میں یک جہتی کے احساس کو مزید پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ اسلامی عینیّت کے حوالے سے ہر قومی ریاست بتدریج ایک نظریاتی ریاست بن جائے گی، اور ان کا اتحاد بالآخر اسلامی دولت مشترکہ پر منتج ہوگا۔

اسلامی تحریک کی طاقت کیا ہے اور یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟ مغرب اسے سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ مغرب نے اسے بنیاد پرست، جنونی، مغرب مخالف، بے وقت اور نہ جانے کیا کیا بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ روّیہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد و معاون نہیں ہو سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب ایک بار پھر یہ خطرناک غلطی کر رہا ہے کہ وہ ایک مختلف طرزِ زندگی رکھنے والوں کو اپنے مخصوص معیارات اور مسخ شدہ تصوّرات کے آئینے میں دیکھ رہا ہے۔

اس افسوس ناک نقطۂ نظر کے نتیجے میں انسانیت پر بے پناہ مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مغرب کے عوام اور پالیسی سازوں کو اسلامی احیاء کی حقیقی نوعیت کے بارے میں غلط معلومات فراہم کی جا رہی ہیں اور انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کے ایک ناخوشگوار باب کی روشنی میں ان معاملات کو دیکھیں۔ تحریکِ احیائے اسلام مستقبل کی جانب دیکھنے والی ایک تحریک ہے اور عیسائی گروہوں کی بنیاد پرستانہ سوچ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے جدّت سے وابستہ مسائل اور ٹیکنالوجی کے چیلنجوں سے آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اسلام کے اصل ماخذوں، یعنی قرآن اور سنّت پر اس کا زور دینا اس کی لچک کا مظہر ہے۔ اس میں اختراع کی صلاحیت ہے کیوں کہ احیائے اسلام کی تحریک میں قدامت پرستی کا روّیہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص فقہی مسلک سے ہی منسلک رہا جائے۔ یہ تمام امکانات ان تجزیہ نگاروں کی طرف سے نظرانداز کر دیے جاتے ہیں جو موجودہ اسلامی دنیا کو ایسی Categories کی صورت میں دیکھتے ہیں جو اسلامی دنیا سے متعلق ہی نہیں۔

موجودہ مسلم ذہن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ہمیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ موجودہ پریشان کن صورتِ حال کے بارے میں مسلمانوں کا ادراک، محض سیاسی بے چینی سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اسلامی احیاء کو سمجھنے کی کوششیں اکثر سراسر سطحی اور متعصّبانہ ہیں۔ یہ نظریہ کہ اسلامی احیاء، بالخصوص ایران کا تجربہ، محض تیز رفتار ترقیاتی کوششوں کا نتیجہ ہے، نہایت ہی سادہ توجیہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترقیاتی پہلو کے اپنے مسائل ہیں، لیکن یہ کہنا سراسر سادہ لوحی کے مترادف ہے کہ مسلم عوام کا اسلامی احیاء کی قوتوں کی طرف بڑے پیمانے پر رجوع اس تناؤ کی وجہ سے ہے جو تیز رفتار اقتصادی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ یہ تشخیص، مسلم معاشرے کے جذبوں کے بارے میں گھمبیر لاعلمی پر مبنی ہے۔

اسی طرح اسلامی احیاء کو محض مغربی استعمار کے خلاف عوام کا غم و غصے سے بھرپور ردعمل قرار دینا بھی گمراہ کن ہے۔ استعمار کے خلاف ردعمل میں کوئی شک نہیں ہے، تاہم یہ ردعمل سیاسی طیش کے اظہار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک زیادہ گہری وجہ ان تصورات، اقدار، حکومت کے نظام اور اداروں سے عدم اطمینان ہے جو مغرب سے درآمد کر کے ان پر مسلط کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ عدم اطمینان اپنی قیادت سے ہے، جسے وہ مغربی مفادات سے وابستہ خیال کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیادت مغربی ترقی کے نمونوں اور اقدار کو مسلم معاشروں پر مسلط کرنے کے لیے محض آلہ کار ہے۔ اس طرح یہ احیاء ایک ہمہ جہتی مظہر ہے۔ ایک طرف یہ عوام کی امنگوں اور تاریخی آئینے میں مسلم تشویش کا اظہار ہے جو حقیقتاً اندرونی اور مقامی عناصر پر مبنی ہے۔ دوسری جانب یہ بیرونی چیلنج کے خلاف ردعمل بھی ہے اور یہ چیلنج استعمار کے خاتمے پر مسلم معاشرے میں بیرونی مداخلت ہے۔

اسلامی احیاء کی تحریک موجودہ مسلم صورت حال کی ناقد ہے اور یہ ہمارے دور کے غالب کلچر، یعنی مغربی تہذیب و ثقافت کی بھی ناقد ہے جو اکثر ملکوں میں چھائی ہوئی ہے۔ یہ تنقید ایک مختلف بنیاد اور مختلف زاویۂ نظر یعنی اسلام کے اصل ماخذوں ــــ قرآن اور سنت ــــ کے حوالے سے ہے۔

یہ تحریک ایمان کے احیاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسلامی احیاء کی یہ بہت بیشتر مغربی تحریروں میں نظر انداز دکھائی دیتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ محض سیاسی اور سماجی ترتیبِ نو کا سوال ہے۔ سماجی نظم یقیناً اہم ہے لیکن نکتہ آغاز ایمان کا احیاء اور اس کا استحکام ہے نیز فرد کی اخلاقی شخصیت اور اس کے کردار کی تعمیرِ نو ہے۔ روحانیت اور عینیّت پسندی کا بے پناہ جذبہ ہے جو سمت کے لیے ایک نیا احساس ابھار رہا ہے اور لوگوں کو اپنی دنیا کی تعمیرِ نو پر آمادہ کر رہا ہے، چاہے اس کے لیے کوئی سی بھی قربانی دینی پڑے۔

استعماری دور میں اور اس کے بعد قیادت کا جو نمونہ سامنے آیا، اس میں ذاتی مفادات کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ اخلاقی قدروں سے اس قدر تہی دامن ہے اور بدعنوانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بدعنوانی اور استحصال طرزِ زندگی بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں اور انہیں عالمی صورتِ حال میں بہت دھچکے برداشت کرنے پڑے ہیں، تاہم بدعنوانیوں کا موجودہ طوفان جو آج مسلم دنیا میں دیکھا جا رہا ہے، بالکل نئی صورت حال ہے۔ مسلمان اس صورتِ حال کو سیکولرزم اور مغربیت کے اثرات بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں انفرادی اور اجتماعی اخلاق جو توحید اور سنّت رسول ﷺ سے وفاداری پر مبنی تھے، غیر ملکی اثرات کے زیر اثر کمزور پڑ گئے ہیں۔ مسلم تجدّد مسلم ممالک میں سیکولرزم کے نفوذ کی کوشش تھی، اس نے مغربی لبرل ازم کی اقدار کو مسلم معاشرے پر اوپر سے تھوپنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے پر روایتی اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کوئی نئی اخلاقیات وجود میں نہ آ سکی۔ یہ وہ اخلاقی

خلا ہے جس میں اقتصادی ترقی اور مادی خوش حالی کے نام پر ذاتی مفادات کے حصول، اپنی دولت میں اضافے اور سماجی و اقتصادی استحصال کی کوششیں عام ہو گئیں۔ اسلامی احیاء معاملات کی اس صورت حال کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ اسلامی اخلاق کی بحالی اور امت کے مادی اور انسانی وسائل کو امت میں سماجی انصاف اور خود انحصاری کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ مسلم نوجوان اسلام کے فراہم کردہ اصولوں اور اسوہ کے مطابق اپنی انفرادی اور سماجی زندگی کی تعمیرِ نو کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اور وہ نہ صرف ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نیا عالمی نظام دُنیا کے تمام پسے ہوئے لوگوں کے لیے امن، وقار اور انصاف کا ضامن بن کر ابھرے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ اسلامی احیاء بنیادی طور پر مسلم معاشرے کی اندرونی، مقامی، مثبت اور نظریاتی تحریک ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس کا دوسری قوتوں سے ربط ہو بلکہ ٹکراؤ بھی ممکن ہے۔ مسلمانوں کا مغرب کے ساتھ، بالخصوص نوآبادیاتی دور میں قریبی ربط سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ اسلامی جوابی روّیے کا سب سے زیادہ فیصلہ کن عُنصر نہیں رہا۔

مسلمان اپنا سماجی اور اقتصادی نظام اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا اُن قوتوں سے تصادم لازمی ہے جو موجودہ حالات کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے حق میں ہیں، اس لیے کشمکش ہو گی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مغربی تہذیب پر مسلمانوں کی تنقید بنیادی طور پر سیاسی تصادم کی کوئی مشق نہیں ہے۔ حقیقی مقابلہ دو ثقافتوں اور تہذیبوں کی سطح پر ہو گا۔ ایک تہذیب اسلامی اقدار پر مبنی ہو گی اور دوسری کی اساس مادیّت، قومیّت پرستی اور سیاسی و اقتصادی لبرل ازم پر ہو گی۔ اگر مغربی ثقافت، عیسائیت، اخلاق کی مستقل اقدار اور ایمان پر مبنی ہوتی تو ربط یا مقابلے کی زبان اور طریق کار کی نوعیت مختلف ہوتی، لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ انتخاب، "الہامی اصول" اور ایک سیکولر مادی کلچر کے درمیان ہے، اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ اس مقابلے کو تمام باشعور انسان محض مغرب اور مشرق کی جغرافیائی ۔ سیاسی حد بندیوں یا عیسائیت بمقابلہ اسلام کے انداز میں دیکھیں گے۔ درحقیقت وہ تمام انسان، چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں، جنہیں ہمارے دور کے روحانی اور اخلاقی بحران پر تشویش ہے، وہ اسلامی احیاء پر اطمینان کا سانس لیں گے، نہ کہ وہ اس سے خائف ہوں گے۔

اقدار اور ثقافت کی سطح پر جاری تنازعے کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس صورتِ حال کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مسلم احیاء میں کوئی مغرب مخالف جراثیم نہیں ہیں۔ مغربی ملکوں اور مسلم دنیا کے درمیان سیاسی تعلق کے حوالے سے یہ تحریک نہ تو مغرب کے حق میں ہے نہ اس کے خلاف، حالانکہ مسلم ممالک اور مغرب کے درمیان دورِ استعمار کی تلخ یادیں موجود ہیں جو تعلقات کو مجروح کرنے کے امکانات رکھتی ہیں۔ اگر چین اور امریکہ کسی

مشترکہ ثقافت اور یکساں سیاسی و اقتصادی نظام کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر سکتے ہیں، تو مغرب اور مسلم دنیا آپس میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ بہت حد تک اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغرب اسلامی احیاء کو کن نظروں سے دیکھتا ہے اور اگر مسلم ذہن اور مسلم نقطۂ نظر سے، مغربی طاقتیں، مسلم معاشرے پر مغربی ماڈل مسلط کرنے اور مسلمانوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مغربی غلبے کے نظام کے ساتھ وابستہ رکھنے اور مسلم کلچر اور سوسائٹی کو براہ راست یا بالواسطہ غیر مستحکم کرنے کی کوششیں جاری رکھتی ہیں تو ظاہر ہے کہ کشیدگی بڑھے گی، اور باہمی اختلافات میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اور اگر معاملات، مکالمے اور افہام و تفہیم کے ذریعے پُرامن طور پر، ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کے جذبے سے حل نہ ہوئے، تو ان کا دوسرے طریقے سے حل ہونا ناگزیر ہے۔ اور دوسری طرف اگر ہم تسلیم اور اعتراف کریں کہ یہ ایک مختلف طرز کے معاشروں کی دنیا ہے، مغربی کلچر دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے شانہ بشانہ ان پر غلبہ پائے بغیر پھل پھول سکتا ہے، اور دوسرے لوگ لازمی طور پر دشمن نہیں ہیں، تو اس صورت میں اس بات کا حقیقی امکان ہے کہ ہم اختلاف رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ سکیں۔ اگر ہم اس نقطۂ نظر کی پیروی کے لیے تیار ہیں تو ہم بہت سی مشترکہ بنیادیں اور مشترک چیلنج تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی مستقبل کے عالمی نظام کی کلید ہے۔ کیا ہم تمام ثقافتوں، مذاہب اور اقوام کی بقائے باہمی، بلکہ انہیں اپنی بقاء میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مستقبل روشن ہے۔ مسلم دنیا انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، تاہم اس کا زیادہ تر انحصار مغرب پر ہے کہ وہ اس چیلنج کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔